روس میں پان ترکزم اور اسلام[1]

تلخیص و ترجمہ

(آخری قسط)

آذربائیجان کی آزاد ریاست کی سب سے بڑی حکمراں پارٹی "مساوات" بائیں بازو اور دائیں بازو میں بٹی ہوئی تھی، بائیں بازو کی قیادت رسول زادہ وغیرہ باکو کے دانش وروں کی تھی، جو لبرل ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ انتہا پسند بھی تھے۔ اور دائیں بازو والے طبقہ اشراف کے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر سوویت حکومت سے مصالحت کرنے کے حق میں صرف "مساوات" کا بائیں بازو اور مسلم سوشلسٹوں کا گروہ ہی نہ تھا، بلکہ انتہائی دائیں بازو والے "اتحادی" بھی اس کی تائید میں تھے۔ اتحادیوں پر شیعہ علماء کا اثر غالب تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہ سنی ترکی اتحاد کے مخالف تھے ان کے نزدیک پان ترکزم تعلیمات نبوی کے مخالف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ "اسلام ہمیشہ سے ایک عالمگیر مذہب رہا ہے۔ اور اس کا قومی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اتحاد پارٹی کے ارکان کو صرف اتحاد اسلامی کے نقطۂ نظر سے سوچنا چاہیئے۔ ہماری پارٹی کی ساخت ہی جس میں نہ صرف آذربائیجانی ترک ہیں بلکہ ایرانی اور کاکیشیا کے پہاڑی باشندے بھی شامل ہیں، پیغمبر اسلام کی تلقین کردہ بین الاقوامیت کی عالمگیریت کا ایک واضح ثبوت ہے۔"

غرض سنی ترک قوم پرستوں کی مخالفت میں اتحادیوں نے رضاکارانہ طور پر کمیونزم کے بین الاقوامی عقیدے اور اس کے پروپیگنڈے کی حمایت کی۔ بالشویکوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور "مساوات پارٹی" کے خلاف اتحادیوں کی اس جدوجہد کی بڑی ہوشیاری سے مدد کی اور اس طرح

---

[1] یہ سلسلۂ مضامین ہارورڈ (امریکہ) یونیورسٹی سے شائع شدہ ایک انگریزی کتاب سے ملخص ہے۔ (مدیر)

مافوق قومیت اتحاد کے اصول کے تحت وقتی طور پر انتہائی دائیں بازو اور انتہائی بائیں بازو والے اکٹھے ہوگئے۔ ماورائے کاکیشیا سے برطانوی افواج کے انخلاء اور سفید روسی جرنیل کی شکست کے بعد (مارچ ۱۹۲۰ء) پہلی دفعہ دو سال کے عرصے میں آذربائیجان کی آزاد ریاست سرخ فوج کی زد میں آئی۔ آرمنی کمیونسٹ لیڈر انستاس میکویان[1] کو فروری ۱۹۲۰ء میں آذربائیجان بالشویک پارٹی کا تنظیمی قائد بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے باکو میں ایک الگ آذربائیجانی کمیونسٹ پارٹی بنائی جس نے یہاں وہی کام کیا جو وہ لگا یورال اور روس کے دوسرے ترک علاقوں میں ترک قوم پرست کمیونسٹوں نے کیا تھا۔ باکو کی اس نئی کمیونسٹ پارٹی نے ترک آبادی میں "مساوات" پارٹی کے اثر و نفوذ کو ختم کرنے پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دیں۔ اس زمانے میں انا طولیہ میں مصطفےٰ کمال نے ترکوں کی قیادت سنبھالی، اور اس سے میکویان کا کام اور بھی آسان ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ مصطفےٰ کمال اس میں رکاوٹ نہ بنا، بلکہ اس نے آذربائیجان، آرمینیا اور جارجیا کے ساسکے کنٹرول میں جانے میں مدد دی۔ دراصل اس وقت کمالی ترک یونان سے برسرِ جنگ تھے اور فاتح اتحادیوں (برطانیہ وغیرہ) اور آرمینیوں سے ان کی چل رہی تھی۔ قدرتاً ان کی نگاہیں مدد کے لئے ماسکو کی طرف اٹھیں۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال کو ادھر سے گولہ بارود اور اسلحہ مل گئے۔ سوویت حکومت نے سوچا ہوگا کہ وسطِ ایشیا کے جدیدیین اور قازان کے مسلم سوشلسٹوں کی طرح مصطفےٰ کمال بھی مشرق میں ان کے انقلابی کام کے لئے آلۂ کار بن جائے گا۔

اکیلا آذربائیجان سوویت کمیونسٹوں اور کمالی ترکوں کے متحدہ دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر خود آذربائیجانی حکومت میں بھی اختلافات تھے۔ خان خوئسکی اور قدامت پسند بوژوا گروپ نے رسول زادہ کی طرف سے پیش کردہ کمیونسٹوں اور سوویت حکومت سے پرامن تعاون کی پالیسی کو مسترد کر دیا۔ پندرہ ہزار سرخ فوج آذربائیجان کی سرحد پر داغستان میں تیار کھڑی تھی، ادھر میکویان کے کمیونسٹ خفیہ اڈے برابر طاقتور ہو رہے تھے۔ اور ان کے پاس آدمیوں اور ہتھیاروں کی کمی نہ تھی۔

---

[1] ابھی حال میں انہیں سوویت یونین کا صدر منتخب کیا گیا ہے اس سے پہلے یہ نائب وزیر اعظم تھے۔

لیکن سوویت حکومت کی اتنے وسیع پیمانے پر یہ تیاریاں بے کار تھیں، کیونکہ "مساوات" کی آذربائیجانی حکومت سوویت کے اندازے سے کہیں زیادہ کمزور تھی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو اسے سوویت حکومت اور باکو کمیونسٹوں کے نام پر بارہ گھنٹے کے اندر اندر اقتدار حوالے کرنے کا الٹی میٹم دیا گیا، چنانچہ آذربائیجان پارلیمنٹ کا آخری اجلاس بلایا گیا کیونسٹ پارلیمنٹ کی عمارت کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ غرض بغیر کسی مخالفت کے الٹی میٹم منظور کر لیا گیا۔ اور بالشویکوں کو اقتدار حوالے کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ دوسرے دن باکو کے کمیونسٹوں نے نئی حکومت کی تشکیل کی۔ اس میں آٹھ آذربائیجانی مسلمان (سات ہمت گروپ کے کمیونسٹ اور ایک شیعہ ایرانی کمیونسٹ "تنظیم عدالت" کا) اور تین روسی کمیونسٹ تھے۔ مساوات پارٹی کے بورژوائی اور طبقہ اشراف کے دائیں بازو کے بہت سے لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ رسول زادہ نے اسٹالن کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی شخصی دعوت کو مسترد کر دیا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ روس سے باہر فرار ہو گیا۔ بہت سے بائیں بازو کے "مساوات" پارٹی کے ممبر کمیونسٹ صفوں میں شامل ہو گئے۔ اوائل ۱۹۲۰ء میں آذربائیجان میں وہی سوویت حکومت کے دست و بازو تھے۔ لیکن بعد کے سالوں میں ان سے اکثر تطہیر کا نشانہ بنے۔

دو سال بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں آذربائیجان کی آزاد قانونی حیثیت ختم کر دی گئی اور وہ بھی سوویت یونین کی دوسری جمہوریتوں کی طرح سوویت نظام کے تحت ایک جمہوریت بن گیا

کتاب کے آخری باب کا عنوان "نتیجہ" ہے۔ اس میں مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں روس کی خانہ جنگی کے ختم اور سوویت اقتدار کے مستحکم ہو جانے سے روسی ترکوں کی تاریخ کی ایک اہم داستان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سوویت حکومت نے ان ترکوں کی مختلف خود مختار جمہوریتیں بنا دیں جن میں وہاں کے باشندوں کی زبانوں کو سرکاری زبانیں کا درجہ دے دیا گیا۔ اور بظاہر سمجھ لیا کہ اس طرح روسی ترکوں کی قومی امنگوں کی جن کے لئے ترک قوم پرستوں کی ایک پوری نسل جدوجہد کرتی رہی تھی۔ تسکین ہو گئی ہے لیکن عملاً یہ جمہوریتیں سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے کنٹرول میں تھیں۔ غرض ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک سیاسی اظہار رائے اور نئی نسلوں میں ترک قومیت کی روح پیدا کرنے کی ایک حد تک جو آزادی تھی۔ اس کا دور ختم ہو گیا۔ اور سوویت

یونین کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ساتھ روسی ترکوں کی زندگی اور ان کے ذہنوں پر ایک ہمہ گیر و ہمہ جہتی آمرانہ نظام مسلط کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد روسی ترکوں کی ثقافت اور زندگی پر اسلامی اثرات میں بہت زیادہ کمی آگئی اور اس کے مقابلے میں سیکولرزم کا اثر بہت بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں مصطفےٰ کمال پاشا برسر اقتدار آئے اور وہاں بھی سیکولرزم کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد روس کے ان سکولوں میں جہاں روسی ترکوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسلام کی تعلیم بند کر دی گئی۔ مساجد کے میناروں سے موذنوں کے لئے اذان دینے کی اجازت نہ رہی۔ مساجد جزوی طور پر بند ہو گئیں اور تھوڑے بہت جو دینی مدارس رہ گئے تھے، ان میں طالب علموں کے لئے تعلیم حاصل کرنے پر پابندیاں لگ گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پہلے ۱۹۲۵ء - ۱۹۲۷ء میں روسی ترکوں کا رسم الخط عربی سے لاطینی میں اور پھر ۱۹۳۷ء - ۱۹۳۹ء میں روسی میں بدل دیا گیا۔ اور اس طرح روس کے ترک باشندے تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے باقی اسلامی دنیا سے منقطع ہو کر رہ گئے۔

مصنف نے کتاب کے آخری باب میں روس میں پان ترکزم اور اسلام" کی اس تمام جدوجہد پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روسی ترکوں میں دراصل بیداری کی تحریک کا آغاز "پان اسلامزم" سے ہوا تھا جس کے نظری قائد سید جمال الدین افغانی تھے، یہی وہ تحریک تھی، جس نے روس میں آباد تمام ترک باشندوں میں وحدت کا احساس پیدا کیا، اور ان میں سیاسی شعور کی روح پھونکی اس کے بعد ان کے ہاں ترکیت و اسلامیت سے ملی جلی ترک قومیت کی نشوونما ہوئی، جس نے آگے چل کر پان ترکزم کی شکل اختیار کر لی۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ "پان ترکزم" کا جذبہ تمام تر سطحی تھا، اور اس کی جڑیں نہ تو ترکوں کی تاریخ میں تھیں اور نہ ان کے قومی و ثقافتی شعور میں نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے نہ تو روسی ترکوں میں قومی اتحاد پیدا ہو سکا اور نہ وہ مل کر اور ایک ہو کر کوئی مثبت سیاسی اقدام کر سکے۔ بلکہ روس کے مختلف علاقوں میں آباد ہونے کی وجہ سے نہ ان کی زبان ایک رہ سکی اور نہ وہ اپنی جغرافیائی وحدت قائم رکھ سکے۔ اور اکثر اوقات ان میں آپس میں تفرقات پیدا ہوتے رہے۔ وولگا یورال کے نسبتاً ترقی یافتہ تاتاریوں سے کم ترقی یافتہ بشکیری، ترکمانی اور قازقی اکثر بدظن رہتے تھے۔

روسی ترکوں کی قومیت کی جدوجہد کا تو یہ انجام ہوا۔ ان میں اسلام کی جو تحریک اٹھی تھی، وہ اس لئے زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی کہ اوّل تو ترک قدامت پرستوں اور جدیدیین (ماڈرنسٹ) میں شروع ہی سے اختلاف پیدا ہوگیا، جس نے اکثر اوقات منافرت کی شکل اختیار کی۔ اور بارہا ایسا ہوا کہ جدیدیین کو قدامت پرستوں کی زیادتیوں سے بچنے کے لئے بالشویکوں کی پناہ اور مدد لینی پڑی۔ اسی طرح کہیں کہیں قدامت پرستوں نے قوم پرست جدیدیین کے مقابلے میں بین الاقوامیت کے حامی بالشویکوں کو ترجیح دی۔ اور ان سے سیاسی گٹھ جوڑ کرلیا۔ ابتدا ہی سے ترک جدیدیین کا رجحان ایک حد تک سیکولرزم کی طرف تھا۔ شروع میں تو ان کا سیکولرزم زیادہ نمایاں نہ تھا، بلکہ وہ اسلامیت ہی کی بظاہر ایک شکل بتائی جاتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ سیکولرزم کا زور بڑھتا گیا۔ اور اس نے پہلے محدود ترک قومیت اور بعد میں پان تاتارزم کی شکل اختیار کرلی، جس سے ترکوں کے ہاں جو اسلامی تحریک تھی اس کو بڑا نقصان پہنچا۔

مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے روسی ترکوں میں اسلامی و قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی، ۱۹۱۷ء میں وہ ایک اہم ارتقائی مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ افسوس ہے کہ کمیونسٹ انقلاب اور اس کے بعد کی خانہ جنگی کے دوران روسی ترک بحیثیت مجموعی کوئی مثبت اقدام نہ کرسکے۔ اور ان کے علاقے ایک ایک کرکے بالشویک تسلط میں آگئے۔ اور اس طرح ان کی قومی تحریک جو اب اس منزل میں داخل ہو رہی تھی جہاں اس کے بارآور ہونے کی توقع کی جاتی، ناتمام رہ گئی اور ترک قومیت اور ترک ذہن ایک اور قالب میں ڈھلنے پر مجبور کردیا گیا۔

اب جہاں تک روایتی اسلامی ثقافت کا تعلق ہے، روسی ترکوں میں اس کے اثرات بتدریج کم ہوتے جا رہے ہیں اور وہ بالکل سیکولرزم میں رنگے گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی ترکی قومیت بھی اسی طرح ناپید ہوجائیگی اور وہ سلاوی روسیوں میں مدغم ہوکر رہ جائینگے ان میں اب تک اپنے ترک ہونے کا احساس ہے اور پھر ان کی قومی و علاقائی زبانیں بھی زندہ ہیں، اور ظاہر ہے زود بہ ترقی بھی ہیں۔ مصنف کے نزدیک روسی ترکوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے لیکن یہ کہ وہ آگے چل کر اپنی انفرادیت بالکل کھو دیں، یہ ممکن نظر نہیں آتا۔